Rooh-e-Tahqeeq, Vol.03, No.03, July – September 2025

غلام الثقلین نقوی کا سفر نامہ ''ٹرمینس سے ٹرمینس تک'': ایک مطالعہ

A Study of Ghulam-Us-Saqlain Naqvi’s Travelogue "Terminus Se Terminus Tak"

Atiq-Ur-Rehman
PhD Research Scholar (Urdu), Ghazi University, Dera Ghazi Khan
atiqurrehman19888@gmail.com

Dr. Muhammad Said Ali
Lecturer in Urdu, Ghazi University, Dera Ghazi Khan
msali@gudgk.edu.pk

Abstract:
Ghulam-Us-Saqlain Naqvi holds a distinguished place in contemporary Urdu prose. He is widely regarded as one of the significant modern writers of Urdu literature. His movements from his ancestral village “Bhirath” (Sialkot) to the metropolis of Lahore, along with his explorations of Lahore’s old quarters during his residence there, kept him in a constant state of creative motion. Alongside this, the characters of his short fiction—who frequently journey back and forth between rural and urban settings—reveal the underlying sources of his narrative art. These very aspects also steered Naqvi toward the non-fictional domain of travel writing. To date, three compilations of his travelogues have been published. His debut travel account, “Arz-e-Tamanna” (1988), presents his journey and observations in the sacred land of Hijaz. The second volume, “Chal Baba Agle Shehar” (1993), records his experiences of England. The third and final anthology, issued in 1997 under the title “Terminus se Terminus Tak”, comprises four travel sketches centered on his journeys across Pakistan. These include: “Koh-e-Bagh Sar Ki Taskheer”, “Lahore se Lodowal Tak”, “Karachi Mein Chaudah Roz”, and “Lahore se Chirat aur Landi Kotal Tak”.

Keywords:
Koh-e-Bagh Sar, Travelogue, History, Civilization, Culture, Society, Satire, Vivid Description, Observations.

''ٹرمینس سے ٹرمینس تک'' غلام الثقلین نقوی کی آخری سفری کاوش ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۷ء میں سرگودھا کے ثنائی پریس سے چَھپ کر سامنے آئی۔ اس کا پیش لفظ سجاد نقوی نے لکھا ہے، مجموعی صفحات کی تعداد ۱۸۴ ہے۔ اس کے آخری مُجلد ورق پر وزیر آغا نے کتاب کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور آخری مُجلد ورق کے اندرونی صفحہ پر غلام جیلانی اصغر کی قیمتی شامل کی گئی ہے۔ مصنف نے یہ کتاب اپنے بھتیجے حامد عقیل نقوی اور ان کی اہلیہ روبینہ عقیل نقوی کے نام معنون کی ہے۔ اس سفر نامے میں چار الگ الگ اسفار کو اکٹھا کیا گیا ہے، جن کی ترتیب اور عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ کوہ باغ سر کی تسخیر

۲۔ لاہور سے لوڈووال تک

۳۔ کراچی میں چودہ روز

۴۔ لاہور سے چراٹ اور لنڈی کوتل تک

پاکستانی سفر نامہ نگاری میں عموماً بیرونِ ملک کے مشاہدات اور سیاحت کو زیادہ جگہ دی گئی ہے، جبکہ اندرونِ ملک کی سیر و سیاحت پر کم توجہ دی گئی۔ حالانکہ ہمارے اپنے ملک کے کئی شہر اور مقامات اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے اعتبار سے

کسی بھی غیر ملکی مقام سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی سیاح بھی پاکستان آ کر یہاں کی قدرتی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے چند ادیب ایسے بھی ہوئے جنھوں نے پاکستان کے مختلف علاقوں کو اپنے سفر ناموں میں اجاگر کر کے قومی محبت کا ثبوت دیا۔ انہی میں ایک اہم نام غلام الثقلین نقوی کا ہے۔ اگرچہ اُن کی توجہ زیادہ تر بیرونِ ملک کے اسفار پر رہی، مگر اس کتاب میں انھوں نے پاکستان کے سفر نامہ نگار کی حیثیت سے اپنے حصے کا حق بخوبی ادا کیا ہے۔

غلام الثقلین کی سفر نامہ نگاری میں کم لکھنے کی ایک بڑی وجہ یہ رہی کہ اپنے ادبی سفر کے آغاز میں وہ زیادہ تر افسانہ نگاری کی طرف مائل رہے۔ یہی سبب ہے کہ سفر نامہ کی صنف کی طرف ان کی توجہ نسبتاً دیر سے مبذول ہوئی، یعنی اس وقت جب وہ عمر کے نسبتاً بڑے حصے میں داخل ہو چکے تھے۔ اس عمر میں طویل اور بار بار سفر کرنا ان کے لیے آسان نہ تھا، اور اس میں اُن کی جسمانی کمزوری بھی مانع رہی۔ ذیل میں اُن کے اندرونِ ملک سفر ناموں کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

(ا) کوہِ باغ سر کی تسخیر: یہ سفری تحریر ۱۹۸۲ء میں سامنے آئی اور شاید غلام الثقلین نقوی کی اس صنف میں یہ پہلی کاوش ہے، تاہم اس کی اشاعت کافی عرصے بعد عمل میں آئی۔ مصنف کا یہ سفر نامہ آزاد کشمیر میں واقع کوہِ باغ سر کی بلندی کو ناپنے اور اس پہاڑی چوٹی کو سر کرنے کی روداد ہے۔ مصنف کے مطابق انہوں نے اس چوٹی کو فتح کیا اور یوں اپنی ایک ذاتی کامیابی کا ریکارڈ قائم کیا۔ "باغ سر" دراصل قلعہ باغ سر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قلعہ قدیمی حیثیت کا حامل ہے۔ جس کی تعمیر مغلیہ سلاطین کے دور میں ہوئی۔ یہ قلعہ ضلع بھمبر (آزاد کشمیر) کے نزدیک "وادیٔ سماہنی" میں واقع ہے۔ وادی سماہنی ہی ثقلین نقوی کے جدِ امجد کا مسکن ہے۔

بعض مؤرخین کے مطابق قلعہ باغ سر کی تعمیر کا سہرا ڈوگرہ حکمرانوں کے سر جاتا ہے، اور یہ کام بالخصوص غلام سنگھ ڈوگرہ کے بھائی، راجہ دھیان سنگھ ڈوگرہ کے حکم پر انجام پایا۔ یہ قلعہ اپنی محل وقوع کے اعتبار سے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ سطحِ سمندر سے تقریباً 975 میٹر (۳۱۹۹فٹ) کی بلندی پر تعمیر کیا گیا ہے، جو اسے اردگرد کے علاقے پر ایک قدرتی برتری عطا کرتا ہے۔ اسی بلندی کے باعث یہ قلعہ دفاعی نقطۂ نظر سے بھی نہایت مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ قلعے کے ڈیزائن اور ساخت میں اس دور کے فنِ تعمیر کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بیرونی حصے میں قریباً 38 چھوٹے کمرے بنائے گئے ہیں جو مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہوتے ہوں گے، جیسے کہ محافظوں کی رہائش، ہتھیاروں کا ذخیرہ، یا پھر رسدی سامان رکھنے کی جگہیں۔ ان کمروں کی ساخت سادہ لیکن مضبوط رکھی گئی تاکہ وقت اور موسمی حالات کے اثرات کو برداشت کر سکیں۔ اس کے برعکس، اندرونی حصے کو زیادہ شاندار اور وسیع بنایا گیا ہے۔ یہاں ایک بڑا درباری ہال موجود ہے جو بلاشبہ دربار، سرکاری اجلاسوں یا اہم تقریبات کے انعقاد کے لیے مخصوص رہا ہوگا۔ اسی حصے میں ایک حوض بھی تعمیر کیا گیا ہے، جو اس دور میں پانی کے ذخیرے اور فراہمی کا بنیادی ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ مزید برآں، اندرونی حصے میں 43 کمرے موجود ہیں جو انتظامیہ، شاہی خاندان یا خاص مہمانوں کی رہائش کے لیے بنائے گئے ہوں گے۔ قلعے کی حفاظت اور آمد و رفت کے لیے مرکزی دروازے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ دروازہ قلعے کے شمالی سمت میں واقع ہے، جو نہ صرف دفاعی اعتبار سے ایک محفوظ مقام تھا بلکہ آمد و رفت کے لیے بھی موزوں سمجھا جاتا تھا۔ دروازے کی ساخت ایسی ہے جو اس دور کی فنِ تعمیر کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ مضبوطی اور پائیداری کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اور دوسرا داخلی دروازہ جنوب مشرق کی جانب کھلتا ہے۔ روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک مغل بادشاہ کے انتقال کے بعد، اُن کی میت کو قافلے کے راستے میں عارضی طور پر قلعہ باغ سر میں دفن کیا گیا، تاہم بعد ازاں اُسے لاہور منتقل کر دیا گیا۔

غلام الثقلین نقوی قلعے کے اندرونی حصے کا مشاہدہ تو نہ کر سکے، لیکن پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور اس کو اپنے لیے ایک یادگار کارنامہ قرار دیا۔ سفر نامے کے آغاز میں انہوں نے اپنے آبائی علاقے ساہنی سے جذباتی تعلق اور نسبی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے، جس کا تفصیلی ذکر ہم اس تحقیق کے پہلے باب میں کر چکے ہیں۔ مزید برآں، مصنف نے اپنے بچپن کی ایک یاد بھی شامل کی ہے جب وہ ۱۹۴۵ء میں سکاؤٹ ٹیم کے ساتھ تارادیوی (کشمیر) گئے تھے۔ اس وقت سکاؤٹنگ ہیڈ کوارٹر وہاں قائم تھا۔ ایم آئی شمیم نے ان کے رہنما تھے۔ جبکہ کیمپ کی نگرانی رونقی اگروال کر رہے تھے۔ مصنف کے ایک دوست قریشی صاحب ان کے ہم رکاب تھے۔ تارادیوی کے علاقے شملہ رج کی دلکشی اور فطری حسن کو مصنف نے بڑی محبت سے بیان کیا ہے اور اسے اپنی یادوں کا حصہ بنایا ہے۔

سفر نامہ **"کوہِ باغ سر کی تسخیر "** کا ورق اول وادیِ ساہنی کی حسین فضا سے کھلتا ہے۔ یہ سفر دراصل مصنف کے تایا زاد بھائی، صوبیدار خادم حسین نقوی کے فرزند کی شادی کی تقریب میں شرکت کے بہانے اختیار کیا گیا۔ تاہم یہ پہلو بھی نمایاں ہے کہ مصنف نے اس موقع کو صرف ایک سماجی تقریب تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے ایک علمی و سیاحتی تجربے میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس سے قبل وہ اپنے مرحوم تایا کے چہلم پر اس وادی میں آ چکے تھے، لیکن اُس وقت کے حالات ایسے نہ تھے کہ ارد گرد کے مقامات کا مشاہدہ ممکن ہوتا۔ موجودہ سفر کے دوران جب شادی کی برات دلہن کو لینے کے لیے سیالکوٹ روانہ ہوئی تو مصنف نے اس فراغت کو ایک موقع کے طور پر استعمال کیا اور باغ سر کی چوٹی سر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مہم میں اُن کے چھوٹے بھائی سجاد نقوی، پھوپھی زاد بابا سجاد نقوی اور ماموں زاد ممتاز نقوی بھی شریک تھے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ چوٹی کی جانب عملی پیش قدمی سے قبل مصنف نے وادیِ ساہنی کی تاریخ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کا تجزیہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ مصنف محض ذاتی مشاہدے تک محدود نہیں رہتے بلکہ اپنے سفر نامے کو ایک تاریخی و تحقیقی حیثیت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں سفر نامہ بیک وقت ذاتی تجربے، خاندانی وابستگی اور تاریخی شعور کا امتزاج بن کر سامنے آتا ہے۔

مصنف کے نزدیک کوہِ باغ سر کی تسخیر محض ایک جغرافیائی مہم نہیں بلکہ ایک داخلی اور نفسیاتی سفر بھی ہے۔ اگرچہ راستے میں مختلف رکاوٹیں اور مشکلات سامنے آتی ہیں، لیکن اُن کی شدتِ جذبات اور ولولۂ شوق ان مشکلات پر غالب رہتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ متن صرف ظاہری مناظر کی روداد نہیں بلکہ ماضی کی بازیافت اور ذاتی تجربے کے بیانیے کا حسین امتزاج ہے۔ مصنف اپنی تحریر میں نہ صرف آبائی ورثے اور خاندانی حوالہ جات کو شامل کرتے ہیں بلکہ اپنی طبیعت، مزاج اور پسند و ناپسند کو بھی جاندار انداز میں ابھارتے ہیں۔ اس طرح سفر نامہ بیک وقت ذاتی یادداشت، اجتماعی روایت اور جمالیاتی مشاہدے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ غلام الثقلین نقوی کے اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت اُن کا کرداروں کے ساتھ تخلیقی رشتہ ہے۔ وہ کرداروں متن کے دھارے میں اس طرح سمو دیتے ہیں کہ قاری بھی لاشعوری طور پر اُن کا ہم سفر بن جاتا ہے۔ یہی فنی خصوصیت قاری کو متن سے محض ایک مشاہدہ کار نہیں بلکہ فعال شریکِ سفر بنا دیتی ہے۔

چوٹی کی جانب سفر کے دوران ایک جھیل کا ذکر اس اسلوبیاتی رجحان کو مزید گہرا کرتا ہے۔ یہ جھیل اگرچہ وسعت میں زیادہ بڑی نہیں، مگر اس کی دلکشی اور منظر کشی متن کو ایک جمالیاتی بُعد عطا کرتی ہے۔ جھیل کا بیان قاری کے لیے بصری اور حسی تجربے کی تشکیل کرتا ہے، جو صرف جغرافیہ نہیں بلکہ ایک طرح کی علامتی معنویت بھی رکھتا ہے۔ جھیل

کے کنارے موجود دکانیں اور جیپ روڈ سہولت اور آسانی کی علامت ہیں، مگر مصنف شعوری طور پر سہولت کو رد کر کے "سَیر" کے بجائے "سَر" کرنے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس فرق کو وہ نہایت واضح طور پر بیان کرتے ہیں اور یوں "سَر" اور "سَیر" کے درمیان ایک فکری و استعاراتی امتیاز قائم کرتے ہیں۔ یہ امتیاز دراصل انسانی عزم، جستجو اور مقصدیت کی علامت کے طور پر قاری کے سامنے آتا ہے۔ سید سجاد نقوی لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک سیاح کی آنکھ اس بچے سے مختلف نہیں ہوتی جو کسی چیز کا پہلی دفعہ نظارہ کرتا ہے تو اس پر حیرت و استعجاب کے ساتھ ایک عجیب قسم کی بہجت و مسرت طاری ہو جاتی ہے۔"(۱)

اگرچہ قلعہ باغ سر کی جغرافیائی و تاریخی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے، پھر بھی مصنف نے قلعے کے بارے میں جو بحث کی ہے، اس سے کئی سوال جنم لیتے ہیں۔ جب قلعہ باغ سر کی تاریخ جاننے کی کوشش کی گئی تو سب سے پہلے ایک مقامی نوجوان سے استفسار کیا گیا۔ تاہم اس نوجوان کو نہ تو قلعے کی تعمیر کے صحیح دور کے بارے میں علم تھا اور نہ ہی یہ معلومات کہ اس کی تعمیر کس نے کرائی۔ بابا سجاد کے مطابق یہ قلعہ بادشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں بنایا گیا تھا اور ایسے متعدد قلعے اس خطے میں تعمیر کیے گئے تھے۔ مصنف کے پاس اس رائے کی تردید کے لیے کوئی مضبوط تاریخی دلیل موجود نہ تھی۔ مزید تحقیق کے پیشِ نظر مصنف نے ڈاکٹر غلام حسین اظہر کو مکتوب ارسال کیا۔ ان کی جانب سے موصولہ جواب نے قلعے کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر اظہر کے مطابق یہ قلعہ دراصل گلاب سنگھ کے زمانے میں بنایا گیا تھا۔ تعمیری بنیادی وجہ خطے کے مسلمان راجگان کو زیرِ اثر لانا اور اُن کی مزاحمت کو کمزور کرنا تھا۔ تاریخی تناظر میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اُس دور میں یہ علاقہ بھمبر کے حکمران راجہ سلطان خان کے زیرِ اقتدار تھا۔ سلطان خان ایک مردِ مجاہد کے طور پر ڈوگرا راج کے خلاف طویل عرصے تک برسرِپیکار رہا، لیکن بالآخر اُسے قلعہ باہو (جموں) میں قید کر دیا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قلعہ محض ایک دفاعی ڈھانچہ نہیں تھا بلکہ اس کے قیام کے پیچھے سیاسی اور فوجی حکمتِ عملی کار فرما تھی۔ مزید بر آں، اس قلعے کے دامن میں واقع بنڈالہ گاؤں میں ڈوگرا افواج کی ایک مستقل چھاؤنی قائم کی گئی تھی، جو اس کی اسٹریٹیجک اہمیت کو مزید واضح کرتی ہے۔ قلعے کی تاریخ کے حوالے سے ان کی آراء قابلِ غور ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے "کوہِ باغ سر کی تسخیر" پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلوب کو سادہ، رواں اور سلیس قرار دیا ہے۔ یہی سادگی اس سفر نامے کا حسن ہے۔ اس میں شامل مزاح بھی اسے مزید دلکش بناتا ہے، جس کے چند نمونے متن میں جابجا ملتے ہیں:

"یہ اس وقت کی بات ہے جب میرا سانس نہیں پھولتا تھا۔ اب کیفیت یہ ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے بڑے پھاٹک سے اس کی عمارت تک پہنچنے کے لئے جس گھاٹی پر چڑھنا پڑتا ہے وہ مجھے اگر مونٹ ایورسٹ نہیں تو مری کا کشمیر پوائنٹ ضرور معلوم ہوتی ہے۔ راستے میں کئی بار رکنا پڑتا ہے۔ اپنی انسٹھ سالہ جوانی کا بھرم رکھنے کے لئے یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ میں تو یونہی گھاٹی کے کنارے لگے ہوئے پھولوں کی بہار دیکھنے کو رک گیا ہوں یا اپنے کسی رفیقِ کار کا انتظار کر رہا ہوں جس نے اس درخت کے نیچے گھائی کے عین درمیان مجھے پیچھے سے آلینے کا وعدہ کیا ہے۔ طالب علم پاس سے گزرتے رہتے ہیں۔ میری طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ کوئی شناسا طالب علم سلام بھی کر لیتا ہے۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ سر آپ کیوں کھڑے ہیں۔ سانس بحال کر کے میں پھر اوپر کی طرف قدم بڑھاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ آج سے صرف دو اڑھائی سال پہلے جب میرا

سانس نہیں پھولتا تھا میں نے آزاد کشمیر کی وہ چوٹی سر کر لی تھی جو قلعہ باغ سر کے نام سے موسوم ہے اور اس قلعے کے عین نیچے سطحِ سمندر سے تین ہزار فٹ کی بلندی پر "باغ سر" ہے۔"(۲)

سفر نامے کی ایک اور نمایاں خوبی منظر نگاری ہے۔ آزاد کشمیر کی وادی سماہنی اور اس کے گردونواح کے مناظر اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ قاری کے سامنے ایک مکمل فلمی منظر نامہ کھل جاتا ہے:

"سماہنی کا قصبہ جس وادی میں واقع ہے اس کی لمبائی بائیس میل ہے اور چوڑائی کسی مقام پر دو اڑھائی میل سے زیادہ نہیں۔ یہ وادی سماہنی کے نام پر وادیء سماہن کہلاتی ہے اور کم و بیش میدانی علاقے کا نمونہ پیش کرتی ہے۔۔۔ زمین نہایت زرخیز ہے۔ گندم اور مکی کی فصلیں عام ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف کھیت تھے۔۔۔ دن ڈھل چکا تھا۔"(۳)

یہ سفر نامہ اس خطے کی زمینی، تاریخی، تہذیبی و ثقافتی دستاویز ہے۔

(ب) لاہور سے لوڈووال تک: اگر تخلیقی لحاظ سے یہ ثقلین نقوی کا دوسرا سفر نامہ ہے جو ۱۹۸۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اسی برس ۲۱ اپریل کو مصنف عمرہ کی غرض سے مکہ و مدینہ روانہ ہوئے۔ قرائن یہی بتاتے ہیں کہ یہ سفر نامہ ۱۹۸۵ء کے ابتدائی مہینوں (جنوری تا مارچ) میں تحریر ہوا ہوگا، کیونکہ متن میں کسی مقام پر واضح تاریخ درج نہیں ہے۔ نصف اول غالباً ۱۹۸۵ء کے آغاز میں تحریر کیا گیا تاکہ سفر نامہ مکمل صورت میں مرتب ہو سکے۔

عام طور پر اس تحریر کو ایک پیروڈی سفر نامہ تصور کیا گیا ہے، اور خود مصنف نے بھی اسے ایک "خیالی سفر" کا نام دیا ہے۔ یعنی ایسا سفر نامہ جس کا ظاہری ڈھانچہ تو حقیقی ہو مگر بنیادی طور پر یہ تخیل کی پیداوار ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف مصنف نے اپنے دوسرے سفر نامے "کراچی میں چودہ روز" میں بھی کیا ہے۔ تاہم یہ امکان موجود ہے کہ اس کا ایک حصہ حقیقی مشاہدے پر مبنی ہو۔ نصف آخر (۱۹۷۹ء) بنیادی طور پر گاؤں لوڈووال کے مشاہدات کا عکاس ہے، جبکہ پہلا آدھا (۱۹۸۵ء) لوڈووال گاؤں تک کے سفر پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک ہی متن میں دو الگ بیانیے سموئے ہوئے ہیں۔ غلام جیلانی لکھتے ہیں:

"غلام الثقلین نقوی ایک ایسا ملنگ ہے جو زندگی کے روزمرہ سے گھبرا کر سڑک پر نکل آیا ہے۔ دُور پہاڑوں کے پیچھے اس کی منزل ہے۔"(۴)

غلام الثقلین نقوی اپنے مزاج کی عاجزی کے باعث خود کو حقیقی سیاح یا سفر نامہ نگار کی صف میں شامل نہیں کرتے۔ اس تناظر میں وہ اپنی تحریر کو محض ایک محدود ذاتی تجربے کی روداد قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر وزیر آغا نے انہیں "مسافر" قرار دینے کی بجائے ایک "سیاح" شمار کیا جس نے دیارِ غیر کے علاوہ وطن عزیز میں بھی سیاح کا منصب قبول کیا اور اپنے وطن کو دو ٹرمینس کے درمیان پھیلا ہوا ایک تادریافت خطہ قرار دیا اور پھر اسے دریافت کرتے چلے گئے۔"(۵)

سفر کے آغاز میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے شمالی علاقہ جات کی سیاحت کے لیے اپنے ایک افسانے سے حاصل شدہ دو سو روپے مخصوص کیے تھے، لیکن حالات کچھ یوں بنے کہ ان کے بیٹے نے اس رقم میں سے ایک سو اسی روپے خرچ کر دیے اور صرف بیس روپے باقی رہ گئے۔ نتیجتاً ان کے لیے ممکنہ سیاحت محدود ہو کر محض لوڈووال تک رہ گئی۔ یہ پس منظر ان کے بیانیے کو نہ صرف مزاحیہ رنگ عطا کرتا ہے بلکہ تخلیقی صداقت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ مصنف بس

اسٹاپ کے مناظر بیان کرتے ہوئے ایک پرانے درخت کا ذکر کرتے ہیں، جسے وہ اپنے افسانوی مجموعے ''سرگوشی'' کے افسانے ''چھدرا سایہ'' سے جوڑتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی افسانہ نگاری اور سفر نامہ نگاری میں باہمی ربط پایا جاتا ہے اور تخلیقی سطح پر دونوں اصناف ایک دوسرے سے فیض یاب ہوتی ہیں۔

لاہور سے لوڈووال تک تقریباً ۲۷ میل کے سفر میں مصنف مختلف مشاہدات اور تجربات بیان کرتے ہیں۔ ان کی دلچسپ گفتگو اور روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات متن کو مزید جاندار بناتے ہیں۔ ایک موقع پر بس ڈرائیور کی شخصیت انہیں حیرت میں ڈالتی ہے، جسے انہوں نے مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے:

> ''عام طور پر ڈرائیور دونوں ہاتھ سٹیئرنگ پر رکھتے ہیں یا ایک سٹیئرنگ اور دوسرا گیئر پر اس ہیرو کا ایک ہاتھ سٹیئرنگ پر تھا اور دوسرا بال سنوار رہا تھا۔ اور سامنے آئینہ بھی تھا جس میں آرائش گیسو کا سارا ڈراما نظر آ رہا تھا۔۔۔ بس ایک ہچکولا کھا کر ایک تانگے کے پاس سے گزری تو میرے خیالات کا سلسلہ چھن سے ٹوٹ گیا۔ مجھے تو یوں لگا جیسے بس اڑ کر تانگے کے اوپر سے گزر گئی ہے کیونکہ ایک جھلک کے بعد مجھے تانگے کی دوسری جھلک نظر نہ آئی۔
>
> ''واہ استاد! سالا یاد ہی کرے گا کہ کسی بس ڈرائیور سے واسطہ پڑا تھا؟'' کنڈکٹر نے ڈرائیور کے اس کرتب کی داد دیتے ہوئے کہا۔
>
> ''اس وقت پوری ٹرانسپورٹ میں استاد جیسا ڈرائیور ڈھونڈ نکالیے میاں جی! تو پانچ سو روپے انعام دوں گا۔''(۶)

لوڈووال پہنچ کر مصنف کی ملاقات عبدالرحمٰن عرف ماہنا سے ہوتی ہے، جو بعد ازاں ان کے ناول ''میرا گاؤں'' کا مرکزی کردار بنتا ہے۔ اس طرح یہ سفر نامہ محض مشاہدات کی روداد نہیں بلکہ ادبی کردار سازی کے لیے ایک تخلیقی ماخذ بھی ثابت ہوتا ہے۔ گاؤں پہنچنے کے بعد مصنف اپنے ماضی اور بچپن کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ ان کے لیے لوڈووال محض ایک نیا گاؤں نہیں بلکہ اپنے دیہاتی پس منظر کو دوبارہ محسوس کرنے اور شہری زندگی سے وقتی فرار حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ گاؤں کی فضا، ہوا، کھیت، کسان، کنویں اور معاشرتی زندگی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شہر اور دیہات کے تقابل میں دیہات کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

اس سفر نامے میں منظر نگاری نہایت مؤثر ہے۔ لوڈووال کی ہری بھری فصلیں، سبز کھیت، درخت، پودے، پھول اور پگڈنڈیاں اس طرح بیان ہوئی ہیں کہ قاری کے سامنے ایک بصری منظر نامہ کھلتا ہے۔ یہی انداز متن کو محض بیان سے ہٹا کر ایک فلمی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

اسلوب کے اعتبار سے ''لاہور سے لوڈووال تک'' ایک دلکش اور مزاحیہ سفر نامہ ہے۔ اس کی زبان سادہ، رواں اور رنگین ہے۔ مکالمے کے برمحل استعمال اور مزاحیہ جملوں نے قاری کے لیے اسے نہایت دلچسپ بنا دیا ہے۔ ''لاہور سے لوڈووال تک'' غلام الثقلین نقوی کا ایک منفرد سفر نامہ ہے جو حقیقت اور تخیل دونوں کا امتزاج ہے۔ اس میں مزاح، منظر نگاری، دیہی زندگی کی تصویر کشی اور خود مصنف کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ خواہ اسے خیالی سفر کہا جائے یا حقیقی، بہر صورت یہ سفر نامہ اپنے تخلیقی و فنی محاسن کی بنا پر اہم ہے۔

(ج) کراچی میں چودہ روز: غلام الثقلین نقوی نے کراچی میں اپنے چودہ روزہ قیام کے دوران جو کچھ دیکھا، برتا اور محسوس کیا، وہی اس سفر نامے میں یادوں اور تجربات کی صورت قید ہے۔ یہ سفر ۲۳ مارچ ۱۹۹۶ء کی ایک روشن صبح لاہور سے

شروع ہوا، اگلے روز یعنی ۲۴ مارچ کو وہ کراچی کی چہل پہل بھری فضاؤں میں داخل ہوئے۔ ۶ اپریل کو رخصتی کا لمحہ آیا اور ۷ اپریل کو لاہور واپسی کے ساتھ یہ باب اختتام کو پہنچا۔ اس طرح یہ سفر دو ہفتوں پر محیط ایک مکمل داستان بن گیا۔ سفر کی رفاقت میں ان کے چھوٹے بھائی سجاد نقوی، اہلِ خانہ (عترت، عقیلہ، فضیلہ اور میمونہ) اور ماموں زاد بھائی شفقت نقوی بھی شامل تھے۔ یہ سب ایک دوسرے کے ہم سفر بھی تھے اور ہم خیال بھی۔ کراچی میں انہیں یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ڈاکٹر حامد عقیل نقوی (سجاد نقوی کے فرزند) اور ان کی اہلیہ روبینہ عقیل نے نہایت خلوص اور اپنائیت کے ساتھ میزبانی کی۔

اگرچہ مصنف بذاتِ خود کراچی کا سفر بذریعہ ہوائی جہاز کرنے کے خواہاں تھے، تاہم ماموں زاد اور چھوٹے بھائی کے کہنے پر بذریعہ ریل سفر کرنے کا ارادہ کیا تاکہ راستے کی سیاحت اور مشاہدات کا موقع فراہم ہو سکے۔ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے غلام الثقلین نقوی محض مسافر نہیں رہتے بلکہ اپنے مشاہدات کو ادبی قالب میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس تناظر میں وہ معاشرتی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور انتظامی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ ریلوے کے نظام میں کرپشن، خسارے کی وجوہات، بااثر افراد کے منفی رویے اور قومی سرمائے کے ضیاع جیسے مسائل اُن کے مشاہدے میں آئے، تاہم مثبت پہلو بھی ملے، جیسے مختلف لسانی اکائیوں سے تعلق رکھنے والے مسافروں کو اُردو میں گفتگو کرتے دیکھ کر قومی زبان پر فخر کا احساس۔

کراچی پہنچنے پر (۲۴ مارچ کو) اُن کا استقبال ڈاکٹر عقیل نقوی اور بیگم عقیل نے کراچی کینٹ اسٹیشن پر کیا۔ کم و بیش ۲۴ گھنٹے کا طویل سفر طے کرنے کے باوجود مصنف نے پہلے ہی دن مزارِ قائد کی زیارت کو ترجیح دی۔ مزار پر حاضری کے وقت اُن کی جذباتی کیفیت نمایاں رہی، جہاں تحریکِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے کارنامے اُن کے احساسات میں شدت پیدا کرتے ہیں۔ ۲۵ مارچ کو آغا خان اسپتال کا مشاہدہ کیا گیا جو نہ صرف اپنی وسعت اور خوب صورتی کے اعتبار سے منفرد ہے بلکہ جدید طبی سہولیات کا حامل بھی ہے۔ تاہم اسپتال کے بیرونی ماحول میں ٹریفک کا ہجوم بہت زیادہ تھا۔

۲۷ مارچ کو سمندر اور ساحلی علاقوں کی سیاحت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مصنف نے کلفٹن اور عبداللہ شاہ غازی کے مزار کی زیارت کی۔ یہاں وہ اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ ساحلِ کراچی کی وہ خوب صورتی جو میڈیا اور اشتہارات میں پیش کی جاتی ہے، حقیقت میں صفائی کے ناقص انتظامات کے سبب متاثر دکھائی دیتی ہے۔ تاہم عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر اُنہیں روحانی سکون اور تاریخی وابستگی کا گہرا احساس ہوا۔

۲۹ مارچ کو بیرونی علاقوں کا سفر کیا گیا، جن میں ہالے جی جھیل، ٹھٹھہ اور بنبھور شامل تھے۔ ہالے جی جھیل کی ناگفتہ بہ حالت پر مصنف نے تنقید کی، تاہم بنبھور کی تاریخی حیثیت اور سسی پُنوں کی داستانوں نے اُن پر گہرا تاثر چھوڑا۔ بنبھور کی تاریخ بیان کرنے کے لیے مصنف نے ایک کتابچے سے استفادہ کیا اور قارئین کو اس مقام کی تاریخی اہمیت سے روشناس کرایا۔ ۲ اپریل کو کراچی آرٹس کونسل کا دورہ اس سفر کا ادبی نقطۂ عروج ثابت ہوا۔ یہاں محمود شام کی وساطت سے متعدد ادباء و شعراء سے ملاقاتیں ہوئیں جنہوں نے اس سفر کو ادبی لحاظ سے یادگار بنا دیا۔ مصنف کے لیے یہ لمحہ خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ جب محمود شام نے اُنہیں بطور استاد متعارف کروایا۔

۳ اپریل کو منوڑہ کا سفر مصنف کے لیے مایوسی کا باعث رہا، کیونکہ اُن کے ذہن میں موجود سرسبز و شاداب جزیرے کا تصور حقیقت سے متصادم نکلا۔ تاہم کراچی میں ادباء سے ملاقاتیں اس سفر کے قابلِ ذکر پہلو ہیں۔ بالآخر اپریل کی

۶ تاریخ کو مصنف کراچی سے روانہ ہوئے اور اگلے دن یعنی اپریل کی ۷ تاریخ کو گھر (لاہور) پہنچے، جہاں اُن کے اعزہ و اقارب نے استقبال کیا۔ مجموعی طور پر غلام الثقلین نقوی کراچی کے اس سفر اور قیام سے مطمئن دکھائی دیتے ہیں اور شہر کے بارے میں ایک متوازن رائے قائم کرتے ہیں، جس میں مثبت اور منفی دونوں پہلو شامل ہیں۔ انور سدید لکھتے ہیں:

> ''غلام الثقلین نقوی نے کراچی کو ایک زائر کی آنکھ سے دیکھا۔ کراچی کی سڑکوں پر عوام الناس کا سیلاب عبور کیا۔ سمندر کو دیکھا تو ٹیلی ویژن پر دیکھے ہوئے سمندر سے مختلف نظر آیا۔ عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔۔۔ ایک جوہڑ نما جھیل میں بدبودار پانی میں ''نہنگ'' (مگرمچھ) دیکھے۔ مکلی کے قبرستان کی سیاحت کی اور سب سے آخر میں کراچی کے ادیبوں سے ملاقاتیں کیں۔۔۔ (انھوں نے) ان ادبی ملاقاتوں کو اپنی کراچی یاترا کا ماحصل قرار دیا ہے۔'' (۷)

(د) لاہور سے چراٹ اور لنڈی کوتل تک: غلام الثقلین نقوی کا چوتھا اور آخری سفر نامہ بعنوان ''لاہور سے چراٹ اور لنڈی کوتل تک'' ۱۹۹۶ء میں تحریر کیا گیا۔ یہ سفر ۱۹ اور ۲۰ جولائی کی درمیانی شب شروع ہوا اور مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے بالآخر خیبر کے مقام لنڈی کوتل پر اختتام پذیر ہوا۔ اس سفر نامے کی تخلیق کا بنیادی مقصد جیسا کہ اس کے مجموعی عنوان ''ٹرمینس سے ٹرمینس تک'' سے بھی واضح ہے، یہ ثابت کرنا تھا کہ مصنف نے پاکستان کے ایک سرے یعنی جنوبی حصہ (کراچی) سے لے کر ملک کے دوسرے سرے یعنی شمال مغربی سرحد (لنڈی کوتل، خیبر) تک کا سفر طے کر لیا ہے۔ مصن کی یہ کاوش ان کے سفری سلسلے کی تکمیل کی علامت ہے۔

اس بار کے سفر میں بھی غلام الثقلین نقوی کے ہمراہ اُن کے قریبی اور مخلص رفقاء، سجاد نقوی اور شفقت نقوی، قدم بہ قدم موجود تھے۔ گویا یہ تینوں ہمسفر نہیں بلکہ ایک ہی کارواں کی مانند تھے۔ جب وہ چراٹ پہنچے تو وہاں ان کے میزبان ان کے چھوٹے بھائی جواد حیدر نقوی کے صاحبزادے، کیپٹن عابس رضا نقوی تھے، جنہوں نے بھرپور محبت اور خلوص کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ عابس رضا نہ صرف خاندان کا فخر تھے بلکہ ایک کہنہ مشق انجینئر اور چراٹ چھاؤنی کی ایس ایس ورکشاپ کے کمانڈنگ آفیسر کی حیثیت سے اپنی جوانی اور صلاحیتوں کے جوہر بکھیر رہے تھے۔ راولپنڈی اسٹیشن پر پہنچتے ہی ایک خوشگوار منظر سامنے آیا، مصنف کے نواسے اویس حیدر نے مسکراہٹ اور والہانہ محبت کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ پھر یہ بھی سعادت ملی کہ راولپنڈی میں مصنف کے داماد سید غلام السیّدین نقوی پہلے ہی مقیم تھے۔ یوں وہاں ایک دن کا قیام نہ صرف ممکن ہوا بلکہ ایک یادگار مرحلہ ثابت ہوا۔ اس مختصر مگر خوشگوار قیام کے بعد اگلی صبح جب سورج کی نرم کرنیں فضاؤں میں بکھر رہی تھیں، تو مصنف اپنے رفقاء کے ہمراہ ریل کار میں سوار ہو کر چراٹ کی جانب روانہ ہوئے۔ یوں یہ سفر ایک نئے باب کے آغاز کے ساتھ آگے بڑھا۔

چراٹ، جو صوبہ خیبر پختونخوا کے ضلع نوشہرہ کا ایک چھوٹا مگر اہم قصبہ ہے، تاریخی و جغرافیائی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ برطانوی دورِ حکومت میں یہ مقام بطور سینی ٹوریم (صحت افزا مقام) استعمال ہوتا رہا۔ ۱۸۸۶ء میں اس بستی کو چھاؤنی کا درجہ دیا گیا۔ چراٹ کو ایک خوشگوار موسم، صاف فضا اور بلند و بالا چوٹیوں کے باعث سیاحتی حوالے سے بھی مثالی اہمیت حاصل ہے:

> "چراٹ میں داخل ہوئے تو اس کی فضا اتنی خاموش، پر سکون اور سکون آفریں محسوس ہوئی کہ پتہ بھی ہلے تو اس کا نغمہ سنائی دے۔ سلیمان چوک تک ایک دو کاروں اور جیپوں سے ملاقات ہوئی، آدم زاد بہت کم نظر آئے۔ فضا میں پٹرول اور ڈیزل کی بُو بہت کم محسوس ہوئی۔۔۔ کہو کے سائے بہت لمبے ہو گئے تھے کہو اصل میں جنگلی زیتون ہے جس کی لکڑی بہت مضبوط ہوتی ہے اور وزن میں بھی بھاری اس کی چھڑی بہت پسند کی جاتی ہے۔۔۔ چراٹ میں کہیں کہیں چیڑھ کا درخت لگایا گیا ہے اور یہ تجربہ کامیاب ہوا ہے۔ کچھ مقامات پر سفیدے کے درخت بھی نظر آئے۔"(۸)

چراٹ میں قیام کے دوران مصنف کو تین اہم مقامات دیکھنے کا موقع ملا: ٹی وی بوسٹر، راڈار اسٹیشن، ہیلی پیڈ اور آفیسر ز میس۔ ان میں سے اگرچہ ٹی وی بوسٹر اور راڈار اسٹیشن کو وہ قریب سے نہ دیکھ سکے اور صرف دور ہی سے ان کا نظارہ کیا، تاہم ان کی عظمت اور فنی ساخت نے دور ہی سے گہرا تاثر چھوڑا۔ اس کے برعکس، ہیلی پیڈ اور آفیسر ز میس کو انہوں نے قریب جا کر دیکھا اور ان مقامات کے ماحول، ترتیب اور طرزِ تعمیر کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ یوں یہ قیام محض ایک عارضی قیام نہ رہا بلکہ ایک یادگار تجربہ بن گیا، جس نے ان کے سفر نامے میں ایک نیا رنگ شامل کر دیا۔ تاہم اس چوٹی کا منظر جس پر راڈار نصب تھا، ان کی تحریر میں بڑی تفصیل سے بیان ہوا۔ ہیلی پیڈ تک رسائی کے لیے تقریباً سو سیڑھیاں چڑھنا پڑا، جہاں سے دریائے سندھ کا نہایت دلکش اور مسحور کن منظر اُن کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ مزید بر آں، آفیسر ز میس کی عمارت کو انہوں نے خاص طور پر سراہا، کیونکہ اس کے برآمدے سے پورے چراٹ کا نظارہ ممکن تھا۔

چراٹ کے قیام کے دوران مصنف نے سی ایم ایچ (کمبائنڈ ملٹری ہسپتال) کا بھی دورہ کیا جو کیپٹن عابس کے رہائش گاہ کے قریب واقع تھا۔ وہاں اُن کی ملاقات میجر شاہد حسین سے ہوئی۔ اس موقع پر انہیں جنرل احیاء الدین کی تحریر سے بھی استفادہ کرنے کا موقع ملا جس کے مطابق ۱۸۶۱ء کے بعد چراٹ باقاعدہ طور پر بطور صحت گاہ استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اگلے روز فیڈرل پبلک اسکول کا دورہ بھی عمل میں آیا۔ اس وقت اسکول کے پرنسپل مسعود احمد تھے جنہوں نے نہایت گرمجوشی اور اخلاق کے ساتھ مصنف کا استقبال کیا۔ وائس پرنسپل خان فضلِ ربی نے بھی ان سے ملاقات کی اور انہیں ضیافت کی دعوت دی، تاہم مصنف نے معذرت کر لی۔ اس سفر نامے میں جنرل احیاء الدین کے ایک انگریزی آرٹیکل کا خلاصہ بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ چراٹ کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت زیادہ واضح ہو سکے۔

۲۶ جولائی کو غلام الثقلین نقوی اور ان کے رفقاء لنڈی کوتل کے لیے روانہ ہوئے۔ لنڈی کوتل خیبر پختونخوا کے ضلع خیبر کا ایک مشہور قصبہ ہے جو پاک افغان سرحد پر واقع ہے اور اپنی سیاحتی، تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کے باعث ممتاز مقام رکھتا ہے۔ لنڈی کوتل تک سفر کے دوران مصنف کو اس بات کا افسوس رہا کہ وہ سفاری ٹرین، جو پشاور سے لنڈی کوتل تک چلتی تھی، بند کر دی گئی تھی۔ یہ ٹرین محض ایک سفری سہولت نہیں بلکہ انجنیئرنگ کا ایک عظیم شاہکار تھی جسے دیکھنے کی مصنف کو شدید خواہش تھی، مگر یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ تاہم اس کمی کو انہوں نے لنڈی کوتل کی شاہراہوں، چھاؤنی اور باڑہ کے سفر سے پورا کیا اور ان مناظر کو اپنے قاری کے سامنے پیش کیا:

> "لنڈی کوتل کی چھاؤنی میں درختوں کا سایہ دیکھ کر طبیعت کو کچھ سکون حاصل ہوا۔ یہاں ہمیں آفیسر ز میں میں ٹھنڈی ہوا، ٹھنڈا پانی اور گرم چائے ملی تو طبیعت میں کشادگی بھی آگئی۔ اس بلندی پر فضا میں لطافت بھی محسوس ہوئی اور اور گرد کے مناظر میں شان و شوکت کا احساس بھی ہوا۔ واپسی پر لنڈی کوتل کا باڑہ بھی

دیکھا۔ اگر بھیڑ بھاڑ کو رونق کہا جا سکتا ہے تو واقعی یہاں بہت رونق تھی۔ دکانیں بھری ہوئی دیکھیں لیکن گاہک کم تھے۔ دکاندار قسمیں بہت کھاتے ہیں۔ ایک بازار میں کباب تلے جا رہے تھے۔ خوشبو اتنی اشتہا انگیز تھی کہ منہ میں پانی بھر آیا لیکن دھواں اتنا کہ دم گھٹنے لگا۔"(۹)

اگر مجموعی طور پر اس سفر نامے اور مصنف کے دیگر اندرونِ ملک سفر ناموں کو دیکھا جائے جو "ٹرمینس سے ٹرمینس تک" میں یکجا کیے گئے ہیں، تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی بنیاد حب الوطنی، اپنے وطن کی محبت اور پاکستان کے جغرافیائی و تاریخی تنوع کو اجاگر کرنے پر ہے۔ کراچی سے خیبر تک کا سفر دراصل پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا سفر ہے، جو نہ صرف سیاحتی تجربہ ہے بلکہ قومی وحدت اور جغرافیائی تنوع کی علامت بھی ہے۔ ان سفر ناموں میں مصنف نے نہ صرف ذاتی تجربات بیان کیے ہیں بلکہ قاری کو بھی اپنے ساتھ شامل رکھا ہے، تاکہ وہ بھی اپنے وطن کے ان خوبصورت اور تاریخی مقامات کی اہمیت کو محسوس کر سکے۔ یوں یہ سفر نامے غلام الثقلین نقوی کی حب الوطنی، مشاہداتی بصیرت اور ادبی تخلیقیت کے بہترین آئینہ دار قرار دیے جا سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سجاد نقوی (پیش لفظ)، غلام الثقلین نقوی، ٹرمینس سے ٹرمینس تک، (سرگودھا: ثنائی پریس، ۱۹۹۷ء)، ۸۔

(۲) غلام الثقلین نقوی، ٹرمینس سے ٹرمینس تک، ۹۔

(۳) ایضاً، ۲۵۔

(۴) غلام جیلانی اصغر (تبصرہ)، غلام الثقلین نقوی، ٹرمینس سے ٹرمینس تک، اندرونی فلیپ

(۵) ڈاکٹر انور سدید، غلام الثقلین نقوی: شخصیت اور فن، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۱۰ء)، ۱۷۵۔

(۶) غلام الثقلین نقوی، ٹرمینس سے ٹرمینس تک، ۸۲-۸۳۔

(۷) ڈاکٹر انور سدید، غلام الثقلین نقوی: شخصیت اور فن، ۱۷۹-۱۸۰۔

(۸) ایضاً، ۱۶۷-۱۶۸۔

(۹) ایضاً، ۱۸۳-۱۸۴۔

References

1. Sajjad Naqvi (Preface) *Ghulam-Us-Saqlain Naqvi, Terminus Se Terminus Tak*, (Sargodah: Sanai Press, 1997), p.30
2. *Ghulam-Us-Saqlain Naqvi, Terminus Se Terminus Tak*, p.9
3. ibid, p.25
4. Ghulam Jillani Asghar(Review), *Ghulam-Us-Saqlain Naqvi, Terminus Se Terminus Tak*, Inner Flap
5. Dr. Anwar Sadeed, *Ghulam-Us-Saqlain Naqvi: Shakhsiyat Aur Fun*, (Islamabad: Pakistan Academy Of Letters, 2010), p.175
6. *Ghulam-Us-Saqlain Naqvi, Terminus Se Terminus Tak*, p.82-83
7. Dr. Anwar Sadeed, *Ghulam-Us-Saqlain Naqvi: Shakhsiyat Aur Fun*, p.179-180
8. ibid, p.167-168
9. ibid, p.183-184

❖❖❖